یمنیٰ مسعود
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

پنجابی لوک ادب کی روایت: تنقیدی جائزہ

(The Tradition of Folk Literature in Punjab: A Critical Study)

Abstract:

Folk Literature is the body of expressive culture including tales, music, dance, legends, oral history and superstitions. The Province of Punjab is enriched with folk Literature. This folk Literature reflects the culture, civilization and rituals of Punjab. It is a tragic situation because Punjab folk literature is in danger of dying out. Its main reason is that people are not interested in it due to the advancement of modern technology. Folk Literature helps us to understand the cultural and moral values of other people .It represents the colours of human life as passing from person to person or generation to generation. This article will highlight the importance of folk literature and will also search the causes of its demise.

Keywords:

Folk literature, Punjabi Folk Lore, Oral History, Culture, Civilization, Rituals of Punjab, Superstitions, Moral Values, Modern Technology, Demise.

زندگی کے سفر میں جدید تقاضوں اور نئے مطالبوں کو بروئے کار لانے کے لیے عہدِ رفتہ کی روشنی میں اپنی منزل کے نشانات کی تلاش اور جستجو کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی کئی پرتوں کو کریدا جائے۔ ماضی وہ بھی ہے جو چند دہائیوں اور صدیوں قبل گزرا تھا، اور ماضی وہ بھی ہے جو ہزاروں سال پہلے گزر چکا ہے۔ انسان اپنی بیتے ہوئے بعید اور فاصلوں سے اسی طرح وابستہ ہے جس طرح گزرے ہوئے کل یا اس پل سے جو ابھی گزرا ہے۔ انسان کا موجودہ وجود ہزاروں سال پہلے گزرے وجود کا تسلسل ہے۔ وجود کی بات کی جائے تو معاشرت، تہذیب، لسانیات اور رسوم و رواج مل کر ایک اکائی ترتیب دیتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کا ادب اس کی معاشرت کا بیان ہوتا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ کسی بھی زبان کا لوک ادب اس زبان کے بولنے والوں اور

اس معاشرے کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کا خالص اظہار کرتا ہے۔اس ادب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ تصنع سے پاک ہوتا ہے اور اس میں موجود جذبات کی بے ساختگی اور قدرت سے قربت ایک حسن پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوک ادب ایک شخص کے دل سے دوسرے شخص کے دل میں اتر کر معاشرے کی زبان بن جاتا ہے۔ یہ ادب موسیقیت اور نغمگی سے بھرپور ہوتا ہے۔اس کی بناوٹ میں کسی کی دانستہ کوشش شامل نہیں ہوتی،اس کے باوجود یہ ادب سارے معاشرے میں سفر کرتا ہوا اپنی رنگینیاں بکھیرتا ہے اور خوشی، غمی اور محبت جیسے جذبوں کا والہانہ اظہار کرتا ہے۔

جنوں، پریوں اور بھوتوں کی کہانیوں کو عام طور پر لوک کہانیاں کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو دنیا کے قدیم ادب کی بنیاد یہی کہانیاں ہیں۔ کلاسیکی ادب پر ایک نظر دوڑائی جائے تو یہ کہانیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ آج کے دور کا افسانہ، داستان اور مثنوی سب لوک ادب کی بدولت ہی ہیں۔ لوک ادب سینہ بہ سینہ چلتا ہوا ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک صدی سے کئی صدیوں کا سفر طے کرتا ہوا کسی نہ کسی شکل میں ہمارے ساتھ موجود ہے۔ کلیلہ ودمنہ، عیار دانش، داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، ہزار داستان الف لیلہ اور اس جیسی ان گنت کہانیاں لوک کہانیوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئیں اور ہمیشہ کے لیے امر ہو گئیں۔ بہت سی قوموں کے میل ملاپ کی وجہ سے ایک قوم کی تہذیبی اور تمدنی روایات دوسری قوم کی روایتوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود یہ کہانیاں مشرق کی ہوں یا مغرب کی، ان کا تعلق شمال سے ہو یا جنوب سے، سب کے ہاں جنوں بھوتوں کے قصے، نیکی کا درس، برائی سے نفرت، جان تک کی بازی لگا دینے اور دیووں سے مقابلے کرنے والے بہادر سورما موجود ہوتے ہیں۔ان تمام کہانیوں کی بنیاد سچائی اور انسان دوستی ہی ہے۔

لوک ادب کو ماضی کا عکاس بھی کہا جا سکتا ہے جس میں ہم اپنے گزرے ہوئے زمانے کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس کو یاد بھی کر سکتے ہیں۔ ہماری گزری ہوئی نسلوں کے خیالات کیا تھے۔ ان کے معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی زاویے کیا تھے۔ہ خوشی اور غمی کے موقعوں پر کس طرح کی زبان استعمال کرتے تھے۔ان کے وہاں تقریبات، رسوم ورواج اور دوسرے معاملات کے اظہار کے کیا طریقے رائج تھے۔ لوک ادب ان سب چیزوں تک پہنچنے، ان کو جاننے اور ان کی تجدیدِ نو کا آسان ذریعہ ہے۔ عہدِ رفتہ میں لوک ادب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت لوگوں کے پاس تفریح کے مواقع بہت کم ہوتے تھے۔ان کے فرصت ہوتی تھی کہ کہانیاں سن اور سنا سکیں۔ پہیلیاں تخلیق کر سکیں۔ جاڑوں کی سرد راتوں میں واحد قابلِ عمل تفریح بزرگوں یا ہم جولیوں سے علاقے میں نسل در نسل بیان ہوئی چیزیں کہانیوں، افسانوں اور نغموں وغیرہ کی

صورت میں بطوں کو منتول ہونا تھا۔ انگیٹھی کی حدت سمیٹتے بزرگ چھوٹے بچوں کو اپنے سینوں میں مدفون داستانوں سے بہرہ ور کرتے۔ فصل کی کٹائی، بہار اور برسات کے موسم میں عورتیں اکٹھی ہو کر باغوں میں جاتیں۔ جھولے جھولتیں۔ کہانیاں سناتیں اور گیت گاتیں۔ وہ گیت اور کہانیاں جو لوک ادب کا سرمایا تھے اور ہیں۔ نانیاں دادیاں اپنے گھر میں موجود بچوں کو کہانیاں سناتیں اور ایک عہد کی روایات و رسوم و رواج ان کے سینوں میں منتقل کرتیں۔ وہ نسل ایک عمر گزار کر جب بڑھاپے تک پہنچتی تو وہ بھی اپنی اگلی نسل کو قصے کہانیاں اور حکایتیں سناتی تاکہ وہ نسل اعلیٰ اقدار کی حامل ہو سکے۔ لوک ادب کی منتقلی کا انحصار یادداشت پر ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک جاتا ہے۔ انتقال کا یہ عمل معاشرے کی بدلتی ہوئی روایات، رسوم و رواج اور اقدار کے تغیر و تبدل سے بھی گزرتا ہے۔ اور یہ عمل ہر عہد میں مستقل ہوتا رہتا ہے۔ لوک ادب کسی بھی ایک فرد یا کسی خاص جماعت کی سوچ کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک مکمل معاشی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ کے اثرات ہوتے ہیں۔

سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی زبانی لوک روایتیں، سنانے والوں کے اس دنیا سے رخصت ہونے کی صورت میں مٹتی چلی جارہی ہیں اور اس زبان اور ثقافت کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان گردانا جا سکتا ہے۔ گلوبلائزیشن اور عالمی وبائی صورتِ حال کے بعد سے عالمی منظر نامہ یکسر تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ بقا کا دار و مدار مستحکم ذرائع معاش میں سمٹ رہا ہے۔ لوک ادب کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اسے سینہ بہ سینہ سمیٹ اور سینچ کر رکھنے والے عموماً معاشرے کا نسبتاً پسماندہ طبقہ خوشی، غمی، شادی بیاہ کے مواقع پر سینے میں محفوظ کلام سنا کر معاش کا حیلہ کیا کرتا تھا۔ اکیسویں صدی اور وبائی صورتِ حال کے بعد نئی نسل اسے ذریعہ معاش نہیں سمجھتی۔ نتیجتاً سینوں میں لوک ادب کے خزانے لیے بزرگوں سے نئی نسل بوجوہ معاشی حالات کشید نہیں کرتی اور ایک پیڑھی کے عمر رسیدہ ہو کر دنیا سے گزر جانے کے ساتھ ہی لوک خزانہ بھی بنا استفادے کے منوں مٹی تلے دبا جارہا ہے۔ اسے گلوبلائزیشن کا بلیک ہول کہہ سکتے ہیں۔ لوک ادب تہذیب و تمدن کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ تہذیب بغیر کسی خاص مذہب کی تفریق کے بالعموم ایک علاقے اور اس میں موجود تمام مذاہب کے پیروکاروں کی معاشرت کی عکاس ہوتی ہے۔ اسے مذہبی، رزمیہ، خاندانی، عروسی، عمومی خوشی غمی، موسمی تہواروں اور مخصوص میلوں ٹھیلوں کی چاشنی سے پرویا جاتا ہے۔

لوک ادب بہت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ یہ ادب کسی بھی سماج کے کم و بیش تمام افراد کے شعور اور حافظے میں محفوظ ہوتا ہے۔ اور وہ اس ادب کو موقعے کی مناسبت سے عملی طور پر استعمال میں لا سکتے ہیں۔ اس کی

پیش کش سرکاری سطح پر بہت کم ملتی ہے، اس کے برعکس یہ میلوں ٹھیلوں اور گاؤں دیہاتوں میں زندہ رہتا ہے۔ اگر لوک ادب کے خالق کی بات کی جائے تو وہ کسی بھی دیہات کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس کے تخلیق کردہ قصے کہانیاں جب بھی سنائے جاتے ہیں تو دوسرے بھی ان سے سیکھتے ہیں، انھیں سنتے ہیں، انھیں گاتے ہیں۔ اس سارے عمل کے دوران علاقے کی مناسبت سے آپسی آہنگ میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ نانیاں دادیاں جب بچوں کو کہانیاں سناتی ہیں تو وہ اس انداز سے بیان کرتی ہیں جیسے وہ ان کی تخلیق کار خود ہیں۔ ان کہانیوں میں کوئی نہ کوئی سبق چھپا ہوتا تھا جیسا کہانی "سیانی کڑی" میں ڈاکٹر محمد ایوب بتاتے ہیں کہ کیسے ایک چھوٹی لڑکی نے ایک پیاسے بادشاہ کو غٹا غٹ پانی پینے کے مظمرات سے بچانے کو چھوٹا سا تردد کیا اور بادشاہ کے انعام کی حق دار ٹھہری۔ (1)

یا پھر دو دونے چار میں اکرم تاجی پڑھا لکھا ہونہار کیسے ایک خوبرو لیکن مفاد پرست حسینہ کے ہاتھوں مسترد کیے جانے پر آہیں بھرتا ہے، دراصل یہ اسی کا مکافاتِ عمل ہے جو اس نے ادبینہ کے ساتھ کیا ہوتا ہے (2)

ان کہانیوں میں وہ اپنی مرضی سے ماحول اور موقعے کی مناسبت سے تبدیلیاں کرتی رہتی ہیں لوک ادب کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے مثلاً ان کا مصنف گم نام ہوتا ہے۔ یہ گیت اجتماعی سطح پر جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی قوت کے عمل میں تخلیق ہوتے اور گائے جاتے ہیں۔ ان کا لے اور آہنگ کسی عروض اور قاعدے کی بجائے عام لوگوں کے احساسِ موسیقی کے تابع ہوتا ہے۔ عوامی کہانیوں اور قصوں کے ماخذ بھی عام لوگوں کے شیریں اور تلخ تجربات ہوتے ہیں یا پھر زندگی کے مصائب والم سے نجات حاصل کرنے کی خواہش اور ایک اچھی اور بہتر زندگی گزارنے کے خواب ہوتے ہیں۔

لوک ادب کا ایک بڑا حصہ شادی بیاہ کے گیتوں پر مشتمل ہے۔ ہمارے سماج میں مردوں کی تفریح کے بہت سے ذرائع موجود ہیں۔ مرد گھر سے باہر کہیں بھی اپنے لیے کسی نہ کسی طرح تفریح کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ رقص و موسیقی کی محافل جماتے ہیں۔ پدر سری رسومات میں جکڑی خواتین پہلے زمانے میں بھی اور کسی حد تک آج بھی گھروں میں رہتی ہیں۔ دیہاتوں میں عام طور پر خواتین اپنے گھروں کے اندر ہی وقت گزاری کے حیلے بہانے تلاش کرتیں۔ یہ حیلے بہانے شادیوں یا پھر چند دوسری رسومات جیسے منگنی، بچے کی پیدائش، عقیقہ وغیرہ کے وقت پیدا ہو جاتے۔ شادی بیاہ کے گیت میراثنیں بھی گاتیں اور گھر کی خواتین بھی ٹولیوں کی شکل میں گاتیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر یہ سلسلے رات گئے تک جاری رہتے۔ جس میں بچیوں سے لے کر بوڑھیوں تک

سب برابر کی حصہ دار ہوتیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ سنجیدگی کی چادر اوڑھے رکھنے والی خواتین بھی سنجیدگی کی تمام سرحدوں کو پھلانگ کر محفلوں میں رچ بس جاتیں۔ یہ گیت مختلف موقعوں پر مختلف اعتبار سے گائے جاتے ہیں۔۔ مثلاً مایوں، مہندی، سہرے، بارات کی آمد، رخصتی، دلہن کی آمد وغیرہ۔ ہر رسم کے موقع پر رسم کی مناسبت سے شوخ و چنچل بچیاں اور بوڑھیاں سب مل کر ماحول کو چار چاند لگاتیں۔

خوشی غمی اور خاندانی معاشرت کے رسوم و رواج جو پنجاب میں رائج تھے، کسی حد تک ان کا بیان اے۔ڈی۔میک لیگن/ایچ۔اے۔روز کی کتاب میں ملتا ہے جو بغیر کسی مذہبی تفریق کے ہندو اور مسلم دونوں پیروکاروں کی پیدائش،، منگنی، شادی، حمل، موت اور مصنوعی رشتے داری کا تقریباً مکمل احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً:-

"کب بارات روانگی کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لڑکے کو یک گھوڑی پر سوار کرایا جاتا ہے۔ اسے گھوڑی چڑھنا کہتے ہیں اور اس کی بہنیں باگ پھڑائی مانگتی ہیں۔ دولہا اسے استطاعت کے مطابق بھینس یا رقم دیتا ہے۔"(3)

نظم میں بھی ایک بہن کا بھائی کی گھوڑیوں کے بارے میں والہانہ اظہار ملتا ہے۔ مثلاً

"کہیہ لکھ گھوڑی دامل دے ویرا

کہیہ توں دے کے آیا

دو لکھ گھوڑی دامل نی بھیناں

تین لکھ دے کے آیا"(4)

(گھوڑی کتنے کی ہے

کتنے میں خریدی ہے

دو لاکھ کی گھوڑی ہے

میں تین لاکھ میں خرید کر لایا ہوں)

بچوں کا لوک ادب ہمیشہ دل چسپیوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماں کی گود اس کے بچے کے لیے پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ ماں کی گود میں سنی گئی لوریوں سے ہی بچے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں سفر کرنے

لگتے ہیں۔ بچے کا ذہن ان لوریوں سے کس قدر مانوس ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ماں کی لوریاں بچے کو سلانے کے لیے آخری حربے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ لوری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بامعنی ہوں۔ یہ چھوٹے چھوٹے اشعار اور بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ فنی حوالے سے ان میں قافیہ اور ردیف کی قید بھی ضروری نہیں۔ ان لوریوں کے صدیوں پرانے ہونے میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ بچوں کے لیے ابتدائی زبان سیکھنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ درس گاہوں میں جانے سے قبل ہی الفاظ کا ایک ذخیرہ بچے کے حافظے میں محفوظ ہو جاتا ہے جو ابتدائی سطحوں پر علم کے حصول میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

پالنے میں موجود بچہ جہاں ماں اور بہنوں کی لوریاں سنتا ہے، وہیں روایات کا امین بھرائی ملتا ہے۔ جو بچے والے گھر کی چوکھٹ پر لوریاں سنا کر جہاں بچے کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہے، وہیں بدلے میں خاندان سے مالی امداد وصول کرتا ہے۔ اس کی مثال ملاحظہ ہو:-

"سوہنی سوہنی نیندرے

چھیتی چھیتی آجا

ہیرے نوں سواں جا

سفنے وکھاجا"(5)

(میٹھی میٹھی نیند

جلدی سے آجاؤ

لعل کو سلا کر

سخواب دکھاجاؤ)۔

چھوٹے بچوں کے لاشعور میں مٹی سے محبت اور جارحیت پسندوں سے مغلوب نہ ہونے کا درس دیتی لوریاں بظاہر بے ضرر لیکن معنوی اعتبار سے انتہائی گہری بے زاری کو خون میں سرائیت کرتی نظر آتی ہے۔

"واوڑیاں سوں چلے

انگریز پکھا جھلے

مِس کھڈاوی آئی

میرے بچے نوں نیند آئی"(6)

یہ جہاں استعمار اور استعماری نظام کے خلاف انتہائی ابتدا میں ذہن سازی ہے، وہیں اس میں نو آبادیاتی نظام اور توسیع پسندوں کے خلاف بچپن سے علم برداری کا سبق ملتا ہے۔ ہوش سنبھالنے اور بات سمجھنے کے قابل لڑکے اور لڑکیاں اپنے ہم زاد اور ہم جولیوں کے ساتھ کھیل کود، خوشی غمی میں جس طرح پیش آتے ہیں، وہ الگ سے وسیع تر ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے

"لڑکیاں کھیلتے ہوئے پگائی کے بول الاپتی ہیں

"ایچک پیچک

دند کڑیچک

لاواں لاٹو

لاواں ڈور

اُڈے کاواں

جاویں لہور۔۔۔"(7)

گزرے ہوئے زمانے میں انسان اپنی زندگی کے بارے میں واقعات، تجربات اور مشاہدات قصوں کہانیوں کی صورت میں سناتا تھا۔ وہ کہانیاں جوش و جذبے، بہادری اور قومی برتری سے بھرپور ہوتی تھیں۔ بچے اور بالغ دونوں کے لیے ہی ان میں دل چسپی کا سامان ہوتا تھا۔ نانیاں دادیاں اور گھر کے بڑے بزرگ بچوں کو وہ کہانیاں سناتے جن میں دنیا کے عجائبات اور واقعات کی تفصیلات ہوتیں۔ سردیوں کی طویل راتوں کے کچھ حصے بچوں کو جنوں، دیووں اور مافوق الفطرت واقعات کے بارے میں کہانیاں اور قصے سنا کر گزارے جاتے تھے جو کہیں نا کہیں عمر کے آخری حصے تک لاشعور میں کسی نا کسی شکل میں ٹوٹے پھوٹے چینی سرگوشی کی صورت میں موجود رہتے تھے اور وہی قصے اگلی نسل کے ذہنوں تک منتقل کیے جاتے تھے اور اسی طرح یہ سلسلہ ایک نسل سے دوسری نسل تک لوک ادب کی منتقلی کا کام کرتا تھا اور ہے۔ ان کہانیوں میں زندگی کے واقعات کچھ اس انداز سے ملتے ہیں کہ

ان میں اور لوریوں میں یکسانیت کا اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر خوش حال زیدی نے روایتی لوری "چندہ ماما" کی جگہ بچوں کو خوابوں میں پریوں سے ملایا ہے:

"سو جا میرے دل کے ٹکڑے، سو جا میری جان
تو ہے مجھ کو جان سے پیارا، تجھ پر میں قربان
سپنوں کی نگری میں بلائے تجھ کو نندیا رانی
چاند دیس میں جا کر تجھ کو کرتی ہے مہمان
ساری رات تجھے ہونا ہے پریوں کا مہمان
سو جا میرے دل کے ٹکڑے، سو جا میری جان"(8)

پنجاب کا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں بہت سی ذیلی ثقافتیں موجود ہیں۔ یہ ثقافتیں زبان، رسم و رواج وغیرہ کے تھوڑے بہت فرق اور اختلاف کے ساتھ پورے پنجاب میں موجود ہیں۔ پنجاب کا لوک ادب پنجاب کے مختلف علاقوں اور حصوں میں رہنے والے لوگوں میں معاشرتی اور ثقافتی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ایک علاقے میں سُنے جانے والے گیت اور کہانیاں دوسرے علاقوں میں بھی سُنے جاتے ہیں۔ اس سے مختلف علاقوں کے رسم و رواج اور روایات سے آگاہی ملتی ہے اور ثقافتی تعلقات اور ہم آہنگی بڑھنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اُخوت و یگانگت کو فروغ ملتا ہے۔

لوک گیت صرف انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ معاشرے کی ثقافت کے بھی عکاس ہوتے ہیں۔ ان سے ہمیں لوگوں کے مذاہب، تاریخ اور اقدار اور روایات کا معلوم ہوتا ہے۔ بالائی پنجاب اور مجموعی طور پر پنجاب کے لوک گیت سمی، بھنگڑا، لڈی، جھومر، گدا، ماہیا، بولی، جگنی، تھال وغیرہ اپنے اندر ہزاروں موضوعات سموئے ہوئے ہیں۔ مثلاً:

"دوپتر مروڑے نیں
لا کے یاری، دل دریا کر چھوڑے نیں"(9)
(دوپتے مروڑے ہیں
دل لگانے کے بعد ہمارا دل ہر وقت روتا ہے)۔

"جگنی" عورتوں کے پہننے کا ایک زیور ہے۔ یہ زیور ریشمی دھاگوں کی بغیر بل کی رسی میں پرویا جاتا ہے۔اس کے وسطی پھول کا کنارہ سینے اور گلے کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ گلے کے گرد پہنا جاتا ہے اور جگنی گردن کے ساتھ لٹک جاتی ہے۔ لوک ادب میں جگنی کا ذکر وارث ساہ کی "ہیر" میں ہیر کے جہیز کے حصے میں ملتا ہے۔

"سکندری، نیوری، بیر بلیاں، پپل وترے، جھمکے ساریانیں

ہس جڑے، چھبڑ کنگناں، نال بو دا بدھی ڈول میانڑا دھاریانیں

چنن ہار، لوہلاں، ٹکا، نال بیڑا اتے "جگنی" چا سواریانیں"(10)

زیور سے ہٹ کر گیت کی بات کی جائے تو جگنی میں موجود گھنگرو کی آوازوں کو وسیع معنوں مین استعمال کیا گیا ہے۔اور یہی معنوی وسعت پا کر جگنی کسی بھی شخص کے لیے استعارہ بن گئی ہے۔اب یہ جہاں بھی جاتی ہے وہاں کے حال احوال کو بیان کرتی ہے اور زبان زدِ عام ہو جاتی ہے۔

"لوک ناچ" میں مخصوص پنجابی پوٹھوہاری ناچ سمی کے بارے میں غلط العوام تصور کی بہت خوب صورتی کے ساتھ تصحیح کی گئی ہے کہ یہ ناچ صرف عورتوں کے لیے مخصوص نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی مخصوص گیت کی پابندی ضروری ہے۔ وجہ تسمیہ میں مصنف بیان کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے ابتدا میں مشہور گیت

"سمی میری ون میں واری میں واریاں وے سمیاں"

ان کی سنگت میں گایا جاتا رہا ہو جس کی وجہ سے اس کا نام سمی مشہور ہو گیا ہو گا۔(11)

بچپن چوں کہ تصنع سے پاک اور ماورا ہوتا ہے اور لڑکیوں کا بچپن لڑکوں کی نسبت زیادہ معصومانہ اظہار سے لبریز ہوتا ہے۔ بہت سے کھیل ایسے ہیں جو علاقائی سطح پر کھیلے جاتے ہیں اور کھیلتے ہوئے ایسے بول بھی الاپے جاتے ہیں جو علاقائی سطح پر ہی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہیں۔اسی طرز کا ایک کھیل اکنی مکنی بھی ہے جس میں ایک لڑکی کے سر پر دوسری سہیلی نے مکیاں رکھی ہوئی ہیں اور کھیل کے ساتھ ساتھ یہ بول بولتی ہیں:

"اکنی مکنی کناں کُو بھار

اک مُٹھ چک لے، دوجی ہار"

(سر پر اتنا بوجھ ہے کہ ایک مُٹھی اٹھالو تو دوسری کا بوجھ آن پڑے گا)۔(12)

ماہیا ایک ایسی صنف ہے جو پنجاب کے مقبول ترین عوامی گیتوں میں سے ایک کہلائی جاسکتی ہے۔ماہیا حقیقت میں ماہی سے تشکیل پایااور اردو زبان میں ماہی سے مراد محبوب ہے۔تاہم بعض محققین کے نزدیک یہ لفظ بھینس چرانے والوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجازی طور پر محبوب اور بہت پیارے کے لیے بولا جانے لگا۔لوگوں نے اس صنف میں محبت کی داستانوں کو نہایت خوب صورتی سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔در اصل ماہیا ہمارا ایک انمول خزانہ ہے۔ایسا لازوال امر طلائی کہ جس کی قدر و قیمت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہے۔یہ لازوال پھول گزرتے وقت کی آنچ کے ساتھ بھی بوڑھے نہیں ہوئے بلکہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ شاید ماہیا لوک گیتوں کی واحد صنف ہے جو امیر غریب، طبقاتی تقسیم، الٹرا ماڈرن کچن یا سلگتی لکڑیوں والے دھواں دار چولہوں والوں، کوزی ڈرائنگ روم اور دور افتادہ کھیت، سہیلیوں کی ملاقاتیں ہوں یا ہم جولیوں کے جھرمٹ، موسم چاہے کوئی بھی ہو۔۔۔ماہیا ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہر شخص کے دل کی بات کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔یہ پنجاب کا مقبول ترین لوک گیت ہے جس کے موضوعات محدود نہیں اور اس کا شمار ان بہت کم لوک گیتوں میں ہوتا ہے جن میں لوک ریت کا تقریباً ہر موضوع سمایا ہوا ہے۔پھر وہ حسن و عشق کے قصے ہوں یا فلسفہ و نفسیات کے نکات، پروردگار اور پیغمبروں سے والہانہ لگاؤ ہو یا میدانِ رزم کے بہادری کے واقعات، معاشرے پر چوٹ ہو یا طنز و مزاح۔۔۔ماہیا ئیت اور ماہئیت مین تقریباً تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عشق محبت: "سڑکاں تے کھوہ ماہیا

وچھوڑا سجناں دا، پیندا جگر دا لہو ماہیا۔"(13)

(سڑکوں پر کنویں ہیں

ساجن کی جدائی ہمارے جگر کا خون پیتی ہے)۔

توکل: "اُٹھ لمے قطارے نی

روزی رب دے سی کیوں وطن وسارے نی"(14)۔

(اونٹوں کی لمبی قطار ہے

روزی رب دے گا تم نے وطن کیوں بھلا دیا ہے)۔

ماہیا اپنی وسعت میں مذہب کو بھی اسی طرح سموئے ہوئے ہے جس طرح حسن و عشق، وصل فراق اور دوسرے موضوعات کو۔ ذیل میں مثال ملاحظہ ہو:-

"کھلی الماری آ

ہر کوئی وڈا پر رب دی ذات نیاری آ"

(الماری کھلی ہوئی ہے

ہر کوئی بڑا سہی لیکن رب کی ذات سب سے نیاری ہے)۔(15)

انسان کے خطا کا پتلا ہونے پر کوئی دو رائے نہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے رب سے معافی کا طلب گار بھی ہوتا ہے۔ ماہیئے میں اس کا اظہار بھی خوب صورت انداز میں ملتا ہے۔

"سنیار یا گھڑ چاندی

بخشیں گناہ مولا۔۔ بھُل بندیاں توں ہو جاندی"۔

(اے سنار چاندی گھڑو

مولا گناہ بخش دینا آخر غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔)۔(16)

وصل و عشق، جدائی و فراق کے لمحوں اور رب کے تذکرے کے بعد کھنگالنے پر ماہیئے کی وسعت میں جا ئیں تو بے ثبات دنیا اور اس کے روکھے پن کو ماہیا اس طرح سموئے ہوئے ہے کہ سننے اور پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے کہ کیسے فی البدیہہ ماہیا اس بے ثباتی کو بیان کرتا ہے:-

"باہواں نال چوڑی اے

دنیا دا کیہہ اتبار، اللہ دنیا کُوڑی اے"

(بازوؤں میں چوڑی ہے

اے اللہ دنیا پر کون اعتبار کرے یہ تو جھوٹی ہے)۔(17)

ماہیا سننے والا جہاں ایک پل میں بے اعتبار ہو کر فانی دنیا کی بے ثباتی کو روتا ہے، وہیں مان، اعتباد اور یقین کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ ساری دنیا ایک طرف آپ کو ہرانے کی کوششوں میں لگی ہو اور آپ نے اپنی باگ اللہ کے ہاتھ میں تھمائی ہو۔ ایسے توکل کے بعد ساری دنیا کے یک جان ہونے کے باوجود ہرانہ سکنا بھی ماہیئے کے بیان کا خاصہ ہے۔ مثلاً:

"مونڈھے تے کھیسی آ

ہن ساڈا جگ ویری پر اللہ رکھیسی آ"

(کندھے پر کھیس ہے

اب تو ساری دنیا دشمن ہے لیکن اللہ ہمارا مددگار ہوگا)۔(18)

بقول سیموئیل بیرڈ بحوالہ ڈاکٹر کرنیل سنگھ تھنڈ "لوگوں کی زندگی کے روپ، عقل و دانش، طاقت، بہادری، نیکی بدی اور خوب صورتی وغیرہ ایسی حقیقتیں ہوتی ہیں جو لوک گیتوں کو جنم دیتی ہیں۔ تو یہ حقیقتیں وہاں لازمی موجود ہوں گی جہاں لوک گیت ہوں گے۔ اس لیے میں یہ بات یقین کامل کے ساتھ کہوں گا کہ جہاں لوگ ہوں گے وہاں لوک گیت ضرور ہوں گے "(19)

ماہیئے کی وجہ تسمیہ کی ابتدا الگ الگ ادوار میں الگ الگ طرح سے ہوئی ہے۔ پراچین ادوار میں اور نو آباد یاتی دور سے پہلے پنجاب کی الہڑ دوشیزاؤں کی آنکھوں کے تارے، بیلے میں جانور چراتے محبوب کے اصلی ناموں کی بجائے ماہی کہلوائے۔ وہیں دوسری جنگ عظیم میں انگریز حکومت کے جبری بھرتی کے قانون کی بھینٹ چڑھنے والے، پرائی جنگ میں جھونک دیئے جانے والے محبوب ڈھول سپاہی کہلائے۔

لوک ادب اپنی ہر صنف میں جو پہلے بیٹھکوں اور تھڑوں تک محدود تھا، ٹیکنالوجی کا سفر طے کرتا ہوا ریڈیو گراموفون سے ہوتا ہوا شہروں تک پہنچ گیا اور کسی حد تک ٹی وی پر بھی۔ بولیوں کا احاطہ کیا جائے تو ہیئت کے اعتبار اس کی شکل ایک پابند مصرعے یا خاص وزن کی ہوتی ہے جو مخصوص ماتروں کی تعداد پر مشتمل ہوتا ہے اور دو ماتروں کے درمیان ہلکا وقفہ جسے بسرام کہا جاتا ہے کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً

تیرے لیکھے ای جند ڑی لاواں

سروں اے بلاٹل جائے۔(20)

بسرام کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ بولیاں عموماً نغمے کی صورت تالیوں یا موسیقی کے ساتھ گائی جاتی ہیں۔ مثلاً

جدوں توپ نے گولا سٹیا

ٹہنیاں توں پھل ڈگ گئے(21)

ڈھولا لوک گیتوں کی قدیم صنف ہے اور اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا ڈھول باد شاہ اور سمی کی عشقیہ داستان سے ہوئی ہو گی۔ ڈھولے میں عام طور پر فراق کو گوندھا جاتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

رت مڑ آئی ماہی وے

مڑ جاگی جوانی ڈھولا

جاگی جوانی ماہی وے

مڑ لگیاں اڈیکاں ڈھولا(22)

یہ صنف کہیں کہیں عشق و فراق کی حدوں سے کہیں دور نکلتے ہوئے مذہب کا رنگ اپنے اندر سموتی ہوئی اسلامی حوالوں کے ساتھ اپنے جذبوں کا اظہار کرتی نظر آتی ہے جو اس کی خوب صورتی میں اور اضافہ کرتا ہے ۔ مثلاً

ایہہ او بیت المقدس اے بیلیا او

جنھوں اللہ پاک چادتیاں آپ وڈیائیاں(23)

ان اصناف کے بعد کھیل کود سے منسوب الہڑ دوشیزاؤں کے لوک گیتوں کو ککلی، تھال اور چھلا میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام میں ناموں کے تناسب سے ککلی، تھال اور چھلا کے الفاظ لگائے جاتے ہیں تا کہ بولوں کا توازن قائم رہے اس کی ایک عام مثال بچیوں کا گایا جانے والا گیت "ککلی کلیر دی" ہے جو وہ دائرے میں کھیلتے ہوئے الاپتی ہیں اور اپنی خوشیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کی اور مثال دیکھئے

اک اک اک، تیرا غم تیری سک

ساڈی سڑ دی اے ہِک۔ تینوں لینا اے خرید

بھانویں جند جائے وِک تیرا آوے جے خیال

کھیڈاں ہان دیاں نال، دیواں کھِد ونوں اچھال

لے نی کڑیئے پہلا تھال (24)

ڈھول سپاہیئے پہ ماہیئے کو سمیٹتے ہوئے لوک ادب میں رزم کے میدانوں، شجاعت کے قصوں اور خون گرمانے والے لوک گیتوں کی بات کرتے ہیں جنھیں "واراں" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وار کے جنم کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن "خلاصتہ التواریخ" میں سبحان رائے بٹالوی اسے امیر خسرو کے دور میں رائج صنف بتاتے ہیں۔ (18)

وار کے دور کو بیرونی حملہ آوروں خصوصاً مسلم حملہ آوروں سے جوڑنے کی کی "پنجابی لٹریچر" کے مصنف کی رو سے حقیقت سے میل نہیں کھاتی۔ مصنف نے ثبوت کے لیے پہلے دور کی وار "ٹنڈے سراج" کی وار کو بیان کیا ہے جو کہ پورن بھگت، رانی تکشبیلا اور یوسف زلیخا سے مستعار لی ہوئی ہے۔ سکندر ابراہیم دی وار کو پیش کیا ہے جس کا بیرونی حملہ آوروں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ دو مسلم بادشاہوں کے درمیان وجہ نزاع ایک ہندو لڑکی سکندر ابراہیم کی جنگ کی وجہ تھی۔ برِ صغیر میں وار کی ابتدا اگرچہ گورو نانک کے عہد سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کا ثبوت گورو صاحبان کی لکھی ہوئی واروں کے ساتھ انہی کے دیئے ہوئے پہلے سے دیئے واروں کے حوالے بھی ہیں۔ (19)۔ گورو صاحبان نے پہلی دفعہ واروں کو خارجی جنگوں کی رزمیہ شاعری سے نکال کر انسان کی اپنے نفس کے ساتھ داخلی کشمکش کا احاطہ کرنے والا بنایا۔ اور اسے وار کا دوسرا دور کہا جاتا ہے۔

وار کے تیسرے دور میں شاہ محمد کی " سکھاں دی وار " اور نجابت کی " نادر شاہ دی وار " شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔۔ وار کا چوتھا اور آخری دور نئے تجربوں کا دور ہے۔ پنجابی شاعری کی آٹھ سو سالہ روایت کو لے کر نجم حسین سید نے اس صنف میں بے شمار تبدیلیوں کا اظہار کیا ہے۔ اسی گہرے شعور نے ان سے " ملتان شہر دی وار"، "دسا دی وار" اور "بار دی وار" جیسے شاہ کار تخلیق کروائے۔ چوتھے دور میں ایک اور نمایاں نام مشتاق صوفی مشتاق کا ہے جنھوں نے "سید دی وار "لکھ کر وار کو جدید روپ دیا ہے۔

اس تفصیلی بحث کے بعد ہم وار کو تین حصوں رزمیہ، مذہبی اور رومانوی واروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تقسیم ان میں کسی بڑے فرق کو ظاہر نہیں کرتی۔ شاہ چراغ کی "اما م حسین دی وار" اور

گورونانک کی "آسا دی وار" دونوں مذہبی واریں ہیں۔ لیکن اول الذکر میدان کی رزمیہ جب کہ مؤخرالذکر انسان کی باطنی کشاکش سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح رومانوی واریں میں مرزا صاحباں کی واریں رزمیہ شاعری کا حصہ ہیں اور ہیر رانجھے کے بارے میں گائی جانے والی واریں محض عشقیہ واردات کا احاطہ کرتی ہیں۔(20)

دُلے بھٹی کی وار ماں کے تخیل کو الفاظ کے قالب میں یوں ڈھالتی ہے:

"اووی مکھ توں بولدی، دل دچ کرے وچار(21)

وار کے اصل متن کو کتابی شکل میں لانے والوں میں پہلا نمایاں نام ایڈورڈ میکلیگن کا ہے جو تاجِ برطانیہ کی طرف سے نو آبادی پر حکم رانی کی خاطر ان کے رسوم و رواج سے آگاہی اور مروجہ چیزوں کو کتابی شکل میں لاتے ہوئے دانستہ یا نادانستہ پنجابی لوک ادب کو محفوظ کر گئے۔ ان کے بعد دوسرا نام رائے بہادر ہری کشن کا آتا ہے جنھوں نے اس پر مقالہ تیار کر کے پنجاب ہسٹریکل سوسائٹی کے 26 ستمبر 1916ء کے اجلاس میں پڑھا۔ وہ نادر شاہ کی وار کو نجابت کی تصنیف ماننے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں اور راقم ہیں کہ یہ وار ہر ل دور کے کسی مراثی کی بنائی ہوئی ہے جس کو نجابت نے سن کر قلم بند کیا ہے۔(22)۔

کسی بھی معاشرے میں انسان کی زندگی، اس کے جنم سے لے کر اس کی موت تک بہت سے نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ اس تمام عرصے میں مختلف گیت اور کہانیاں کسی نہ کسی انداز سے اس کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں۔ انسان کی زندگی میں بے شمار ایسے حالات و واقعات آتے ہیں جب وہ ان کے اظہار کے لیے لوک ادب کا سہارا لیتا ہے۔

لوک ادب ہمارا عظیم ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ ہے۔ پھر وہ رومانوی ہو یا مذہبی، رزمیہ ہو یا عشقیہ۔ ہر طرح سے ہماری علاقائی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، مادیت پرستی اور مصنوعی ذہانت کے اس دور میں بظاہر بہت خوش نما اور چکاچوند کی دوڑ میں لگ کر دھیرے دھیرے اپنی روایات سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ لوک ادب بنیادی طور پر تفریح کا ذریعہ ہی ہے لیکن تفریح کے نت نئے ذرائع آنے کے بعد نئی نسل اس روح پرور چاشنی سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ تفریح کے نت نئے ذرائع آئے روز منظرِ عام پر آتے ہیں۔ جس کے سبب ہمارا یہ عظیم سرمایہ زوال پذیر اور انحطاط کا شکار ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس بجھتے ہوئے چراغ کی لو کو محفوظ کیا جائے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اس ثقافت سے محروم نہ ہو جائیں۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر ایوب انصاری، باتاں دادی دیاں(بال لوک تال)،(لاہور:مہر گرافکس،2021)،22

2۔ چوہدری نذیر احمد ارمان، ونگاں والی،(جھنگ:مجید بک ڈپو۔2016)،17

3۔ اے۔ڈی۔ میکلیگن/ایچ۔اے۔روز،پنجاب کے رسوم و رواج کا انسئیکلوپیڈیا، مترجم یاسر جواد(لاہور: بک ہوم پبلشرز،1979)،22.

4۔ ویر دیاں گھوڑیاں، تلاش:ارشد میر،(اسلام آباد:لوک ورثہ اشاعت گھر،1986)،63

5۔ لوریاں، مترجم راجا رسالو،(اسلام آباد:لوک ورثہ کا قومی ادارہ،1986،)،88

6۔ ایضاً،90

7۔ تنویر بخاری،بچگانہ لوک ادب،(غیر مطبوعہ مقالہ)،(اسلام آباد:لوک ورثہ)،32

8- ڈاکٹر خوشحال زیدی،اردو میں بچوں کا ادب،(کانپور:ادارۂ بزمِ خضرِ راہ،1989)،285

9۔ افضل پرویز،بن پھلواری،(اسلام آباد: پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹ،1973)،19

10۔ ہیر، مرتبہ:ڈاکٹر فقیر محمد فقیر،(لاہور:تاج بک ڈپو)،233

11۔ افضل پرویز، بن پھلواری،(اسلام آباد: پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹ،1973)،258

12۔ ایضاً،55

13۔ اسلم جدون،ماہئیے،(اسلام آباد:لوک ورثہ اشاعت گھر،1979)،26

14۔ ایضاً،65

15۔ ایضاً،28

16۔ ایضاً

17۔ ایضاً،286

18۔ ایضاً،290

19۔ پروفیسر شارب رودولوی،ماہیا،(لاہور:فیروز سنز،1994)

20۔ ڈاکٹرانعام الحق جاوید،پنجابی ادب دا ارتقا،(لاہور:عزیز بک ڈپو،2004)،576

21۔ ایضاً

22۔ ایضاً،582

23۔ ایضاً،583

24۔ ایضاً،586

25۔ احمد سلیم،لوک واراں،(اسلام آباد: نیشنل کونسل آف دی آرٹس،فوک لور ریسرچ سینٹر،1971)،13

26۔ ایضاً،14

27۔ ایضاً،15

28۔ ایضاً،43

29۔ واراں،مرتبہ ومترجم ڈاکٹر فقیر محمد فقیر،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،1999)،114